قریۂ لیلیٰ
urdukutabkhanapk.blogspot.com
urdukutabkhanapk.blogspot
امین عاصم
www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اَلَّذِی عَلَّمَ بِالْقَلَمِ
عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ
(سُورَۃُ الْعَلَق)

جس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا
جس نے اِنسان کو وہ سکھایا جسے وہ نہیں جانتا تھا

امین عاصم

نام کتاب : قریۂ لیلیٰ
شاعر : امین عاصم
ٹائٹل : گل
باراول : جنوری 2009ء
تعداد : گیارہ سو
قیمت : -/200روپے
مطبع : امتیاز فیاض پرنٹنگ پریس، لاہور

رابطہ شاعر : امین عاصم، کوٹلہ ارب علی خاں، ضلع گجرات
cell.: 0300-6288456
email: ameenasim@gmail.com

Al-Minar Enterprises

Kotla Arab Ali Khan, Distt, Gujrat, Pakistan.

نہ جانے کتنے فسانے تراش لے دنیا
تمہارا نام اگر انتساب میں لکھوں

غزل پہ گرد جمی تھی پُرانے لہجوں کی
اِس آئنے کو مگر کچھ تو صاف میں نے کیا

فہرس

غزل

نظم

زندگی کی تلخیوں سے جنم لیتی ہوئی شاعری

ضلع گجرات میں اپنی سرکاری مصروفیات شروع کیے مجھے ایک ماہ سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا لیکن تا حال یہاں کے ادیبوں اور شاعروں سے ملاقات کا موقع میسر نہیں آیا تھا۔ اگرچہ یہاں کے ادبی ماحول سے میں نا آشنا نہیں تھا۔

شریف کنجاہی سے لے کر شاہین مفتی اور نئی نسل کے ہونہار شاعر سید انصر تک یہاں کے تقریباً تمام شاعروں اور ادیبوں سے میرا تعارف تھا۔ گل بخشالوی اور کاوش بٹ مرحوم کی علاقہ کے لیے ادبی خدمات بھی میرے ذہن میں تھیں۔

گجرات کی سرزمین شعر و ادب کے لیے ہمیشہ زرخیز رہی ہے، یہاں تخلیق ہونے والا ادب نہ صرف ملکی سطح پر بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی نمایاں ہے۔ سو یہاں آ کر میں کسی ایسی ادبی تقریب کا منتظر تھا جہاں بیک وقت میری بہت سے ادیبوں اور شاعروں سے ملاقات ہو جاتی اور پھر میری یہ خواہش سرائے عالم گیر میں منعقد ہونے والے ایک مشاعرے کے ذریعے پایۂ تکمیل تک پہنچی جہاں ضلع گجرات کے تمام نمایاں شاعر شریک تھے۔ مشاعرہ اپنے عروج پر تھا کہ اسٹیج سیکرٹری نے ایک ایسے

شاعر کو دعوت دی جو اپنی وضع قطع سے شاعر سے زیادہ خطیب دکھائی دے رہا تھا، مگر جب شاعر نے اپنی غزل کا مطلع پڑھا تو ایک خوشگوار حیرت میرے وجود میں اُتر گئی۔

جدید طرزِ احساس کے ساتھ عصرِ حاضر کی اذیتوں کا اِظہار کرنے والا یہ شعر گواہی دے رہا تھا کہ شاعر نہ صرف شعر گوئی کا سلیقہ رکھتا ہے بلکہ وہ لمحۂ موجود کی حقیقتوں کو بھی سمجھتا ہے۔ شاعر کی غزل کے بقیہ اَشعار بھی اِنہی کیفیتوں کے آئینہ دار تھے۔

یہ امین عاصم سے میرا پہلا باضابطہ تعارُف تھا۔ گجرات کے نواحی علاقہ سے تعلق رکھنے والا شاعر شاعروں کے اُس قبیلہ سے تعلق رکھتا ہے جن کے نزدیک شاعری مشغلہ نہیں بلکہ ایک مِشن (Mission) ہے، ایک ایسا مِشن (Mission) جو معاشرے میں خیر کی ترویج اور محبتوں کے پھیلاؤ کے لیے انسان کو سرگرمِ عمل رکھتا ہے۔

بعدازاں جب امین عاصم کو میں نے بہت سے مُشاعروں میں سُنا تو اُس کی شاعری پر میرا ایمان مزید پختہ ہُوا۔ وہ Commitment رکھنے والا شاعر ہے، شاعری اُس کے لہو میں رواں دواں ہے۔ مجھے ایسے ہی شاعر اچھے لگتے ہیں جو شاعری کو وقت گزارنے کا نہیں بلکہ زندگی گزارنے کا ذریعہ سمجھتے ہوں اور امین عاصم ایسا ہی ایک شاعر ہے۔

دن بدن امین عاصم کی محبتیں اور شاعری میرے دِل میں گھر کرتی گئیں اور

پھر ایک شام وہ اپنی شاعری کا مسودہ لے کر میرے گھر آ گیا اور کہنے لگا کہ میری شاعری کے بارے میں کچھ لکھ دیجیے جسے وہ اپنے شعری مجموعے میں بطور دیباچہ شامل کر سکے۔ مَیں نے امین عاصم کی شاعری کو رُک رُک کر پڑھا، اُس کے مصرعوں کو بسر کیا اور اُس کے لفظوں میں امین عاصم کو تلاش کرنے کی کوشش کی۔

امین عاصم بنیادی طور پر زندگی کی تلخیوں سے جنم لیتی ہوئی سچائی کا شاعر ہے وہ اپنے اِردگرد پھیلی ہوئی اِنسان کی محرومیوں سے اپنی شاعری کا رَس کشید کرتا ہے۔ اُسے لحہ لحہ پامال ہوتی ہوئی انسانی قدروں کا دُکھ ہے اور یہی دُکھ جب اُس کی شاعری میں ڈھلتا ہے تو ایک ایسی صدا بن جاتا ہے جو ہر گداز دِل میں اُتر کر اُسے رُلا دیتی ہے۔ وہ ایک حوصلہ مند انسان ہے، مگر اُس کے چار اطراف دم توڑتی اِنسانیت اور اذیتوں میں گھری زندگی نے اُس کے مزاج میں تلخی بھر دی ہے اور تلخی اُس کی شاعری میں اِس طرح جھلکتی ہے کہ ہمیشہ ہی سے ایسا تھا اور شاید ہمیشہ ہی ایسا رہے گا، اِسی لیے وہ کہتا ہے۔

وہی ہے دل کی حویلی شکستہ و خستہ
وہی مکین ہے اندر نیا نہیں کوئی

☆

وہی عدو ہے وہی دوستی کا پردہ ہے
یہ میری پشت پہ خنجر نیا نہیں کوئی

جدید شہر کا منظر نیا نہیں کچھ بھی
وہی جنوں، وہی پتھر، نیا نہیں کچھ بھی

☆

وہی ہے قحط مری سرزمیں پہ اب کے بھی
وہی ہے عرصۂ محشر نیا نہیں کچھ بھی

☆

زندگی کا یہ بوسیدہ پن اُس کی مایوسی کی سب سے بڑی وجہ ہے۔امین عاصم بھی ہر اچھے شاعر کی طرح نئے مناظر کی تلاش میں ہے۔وہ یکسانیت سے اُکتایا ہُوا ہے، اُسے لگتا ہے کہ جیسے پردۂ اِسکرین پر ایک ہی سین (Scene) بار بار دُہرایا جا رہا ہے، مگر کمال یہ ہے کہ اِس اُکتاہٹ نے اُس کو بے عمل اور ناکارہ نہیں کیا بلکہ ایک ایسی جدو جہد کا حصہ بنایا ہے جہاں اِنسان نئے جہانوں کی کھوج میں سرگرمِ عمل ہے۔یہی وجہ ہے کہ امین عاصم کے ہاں مایوسی مستقل پڑاؤ نہیں ڈالتی۔امید کا چراغ اُس کے خانۂ دل میں مسلسل روشن ہے اور یقیناً اُمید کے اِسی چراغ نے اُس کے حروف بھی روشن کر دِیے ہیں۔

امین عاصم کا شعری مزاج اگرچہ اِرد گرد کے معاملات کا تخلیقی سطح پر اِظہار کو اہمیت دیتا ہے، یعنی اپنی ذات سے باہر کائنات میں پھیلے ہوئے موضوعات کو زیادہ تر اپنی شاعری کا حصہ بناتا ہے۔لیکن ایسا بھی ہر گز نہیں ہے کہ وہ اپنے اندر کی دُنیا سے بے خبر ہے اور جب وہ اپنے وجود میں برپا حشر کو اشعار میں ڈھالتا ہے،

ایسے مضامین بھی عطا کرتا ہے جو عصرِ حاضر کی نمائندہ غزل کا مزاج تشکیل دے رہے ہیں۔

میں ابد کے سفر پہ نکلا ہوں
زحمتِ اِنتظار مت کرنا

☆

کھولتا ہوں جو پوٹلی دل کی
صرف تیرا ہی غم نکلتا ہے

☆

گھر کی تقسیم سے ہوتا نہیں تقسیم لہو
بھائی ہوتے نہیں دِیوار اُٹھانے سے اُلگ

مجھ سے کیسا مجڑا بیٹھا تھا وہ تاریکی میں
ناگہاں ہو گیا اِک شمع جلانے سے اُلگ

امین عاصمؔ کی شاعری میں آپ کو ایسے لاتعداد خوب صورت اشعار ملیں گے جو پڑھنے اور سننے والوں کے لہو میں ایک عجیب سی سرشاری بھر دیتے ہیں۔

امین عاصمؔ فنی طور پر ایک مضبوط شاعر ہے اُسے شعر کہنے کا ہُنر آتا ہے۔
یہی وجہ ہے کہ اُس کی شاعری میں ایک فطری بہاؤ ہے۔ رواں اور چُست مصرعے

اُس کی تخلیقی صلاحیتوں کی گواہی دے رہے ہیں۔ میرے نزدیک شاعر کی فن پر گرفت ایک ایسی خوبی ہے جس کے ذریعے وہ کسی بھی وقت غیر معمولی ادبی کارنامہ انجام دے سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے میں اُن شاعروں سے ہمیشہ پرامید رہتا ہوں جو شعر کہنے کی قدرتی صلاحیت سے مالا مال ہوں۔ امین عاصمؔ ایسا ہی ایک مضبوط شاعر ہے وہ اپنے پہلے شعری مجموعے کے ذریعے ادبی دُنیا میں باقاعدہ طور پر داخل ہو رہا ہے، لہٰذا ہمیں اُس کا کھلے دل سے استقبال اور اعتراف کرنا چاہیے۔ میری تمام دُعائیں اُس کے ساتھ ہیں۔

قمر رضا شہزادؔ

۲۴ دسمبر ۲۰۰۸ء

امین عاصمؔ نے بڑے بڑے
ادبی مراکز سے دُور اپنے گاؤں میں ایک ننھا
سا دِیا جلا رکھا ہے۔ اہلِ نظر کو چاہیے کہ وہ
اُونچی اُونچی دِیواروں کے شہروں سے باہر آ
کر مضافات میں جلنے والے اِس دِیے کو
دیکھیں کہ اِس کی بھیگی ہوئی لَو اَندھرے
اُجالے کیکیسی جاذبِ نظر تصویر پیش کر رہی
ہے۔ تیز روشنی میں اور اسی طرح گہری تاریکی
میں فن جنم نہیں لیتا ہے، فن تو ملگجی رَوشنی کے
نایاب لمحات میں پیدا ہوتا ہے جب کہ قدرت
نے امین عاصمؔ کو یہ لمحات فراخ دِلی سے
عطا کیے ہیں۔ امین عاصمؔ کا یہ شعر دیکھیے

فاختہ امن کا پرندہ ہے
اِستعارہ، شکار مت کرنا

بیدلؔ حیدری

۳۱۔ اگست ۲۰۰۱ء

عصرِ حاضر کا آئینہ دار

فن تو فنکار کا آئینہ ہوتا ہے، امین عاصمؔ کے اشعار میں سادگی، خلوص، صفائے قلب اور اصلاحِ معاشرہ کے جذبات کی کارفرمائی صاف نظر آتی ہے اور بنی نوع انسان کی کج ادائیوں اور ستم رانیوں پر وہ جیسا کچھ محسوس کرتے ہیں کلام میں اس کے واقعاتِ عشق دہرانے کی بجائے اپنے تجربات و محسوسات کو دیانت داری کے ساتھ پیش کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔

بلاشبہ ان کی شاعری بھی ان کی شخصیت کی طرح پاکیزہ ہے، امین عاصمؔ کے متعدد شعروں میں مجھے بالکل تازہ خیالات اور ندرتِ اظہار نے چونکایا اور محظوظ کیا ہے۔ امین عاصمؔ کی مشقِ سخن میں تیزگامی کے باوصف یہ احساس ہوا کہ وہ وادیٔ خیال کو بقول غالبؔ مستانہ طے کرتے ہیں۔

امین عاصمؔ نے ایسی طرزِ فغاں اختیار کی ہے جس میں سوز و گداز کی پہلو بہ پہلو حوصلہ مندی اور ولولہ انگیزی بھی شامل ہے، اس مجموعے کے شاعر کی تشبیہات و تلمیحات بلاشبہ کلاسکی شاعری سے ماخوذ ہیں لیکن رمز و کنایہ اتنا واضح ہے کہ ہمارے معاشرے کی کج روی، اخلاقی زوال، پست حوصلگی اور بے کرداری کے واضح نقوش ان کی شاعری کے پردے پر اُبھر آئے ہیں۔

میں اس مجموعے کا دعاؤں کے ساتھ خیر مقدم کرتا ہوں۔

پروفیسر مظفرؔ حنفی

(سابق پروفیسر، اقبال چیئر، کلکتہ یونیورسٹی)

ڈی-40 بٹلہ ہاؤس،

نئی دہلی۔25

۱۲۔ اگست 2008ء

حمدِ باری تعالیٰ

ذرّے ذرّے میں پنہاں ہے اِک کائنات
ذرّے ذرّے میں موجود ہے تیری ذات

ذات تیری نہیں اَے خُدا بے ثبات
تجھ پہ قربان سب موت ہو یا حیات

یہ پہاڑوں کے پتھر، یہ پیڑوں کے پات
سب ہی تیری بیاں کر رہے ہیں صفات

تیری منظر کشی ہے میں دیکھوں جدھر
دِیر و کشمیر و کاغان ہو یا سوات

خوب صورت پرندے جو گاتے ہیں گیت
سچ تو یہ ہے اَدا کر رہے ہیں صلوٰۃ

بہتا راوی کہ ہو جھیل سیفُ المُلوک
تیرے مظہر ہیں سب، نیل ہو یا فُرات

حمدِ باری تعالیٰ میں مشغول ہیں
یہ زباں اور یہ آنکھیں، یہ دل اور یہ ہات

نعتِ رسولؐ

گلاب ہو وہ کنول ہو کہ یاسمیں کوئی
رخِ رسولؐ سے بڑھ کر نہیں حسیں کوئی

نہ صادق اُنؐ سے زیادہ ملا کہیں کوئی
نہ اُنؐ سے بڑھ کے زمانے میں ہے امیں کوئی

خدا کا نام تو خیر ایک اسمِ اعظم ہے
ملا نہ نام محمدؐ سے بہتریں کوئی

پھر اُس کو سایۂ رحمت نے عمر بھر ڈھانپا
جو ایک پل کو ہُوا آپؐ کے قریں کوئی

جو کنکری ہوئی مَس آپؐ کے کفِ پا سے
نہیں ہے قیمتی اُس سے دُر و نگیں کوئی

بیانِ مدحتِ احمدؐ کے واسطے عاصم
میں ڈھونڈتا ہوں نئی نعت کی زمیں کوئی

اَے خدائے ذُوالجلال

جس کو چاہے تو گدا گر سے تو انگر کر دے
اے خدا مجھ کو مقدر کا سکندر کر دے

غم ملے یا کہ خوشی، کچھ بھی سروکار نہیں
جیسے چاہے تو مرا ویسے مقدر کر دے

شب کی تاریک فضا جب بھی ڈرائے مجھ کو
تیری یادوں کا دِیا گھر کو منور کر دے

گندگی پھیل چکی ہر سُو تعصب کی یہاں
میری دھرتی کو مصفا و معطر کر دے

مجھ پہ اِنعام ترے کم تو نہیں ہیں مولا!
تو جو چاہے تو مجھے اور بھی بہتر کر دے

میرے لہجے کو عطا کر کے مہک پھولوں کی
ایک اِک لفظ سے دنیا کو معطر کر دے

لبِ دریا

کردارِ مسلماں نظر آیا لبِ دریا
جس شان سے باطل سے وہ اُلجھا لبِ دریا

دریا کو حجاب آیا نہ کیوں نام پہ اپنے
شبیر تھا جب خوں میں نہایا لبِ دریا

جنت میں ہیں وہ کوثر و تسنیم کے مالک
دُنیا نے جنہیں رکھا تھا پیاسا لبِ دریا

اُس دن تو فرشتے بھی بہت روئے تھے جس دن
تڑپا تھا جگر گوشۂ زہراؑ لبِ دریا

یہ غیرتِ دریا نے کیا کیسے گوارا!
سیراب ہُوا خون سے صحرا لبِ دریا

تھی خون میں اصغر کے نہاں برق وہ عاصمؔ
جل جاتی زمیں خون جو گرتا لبِ دریا

محبتوں کا تری اِعتراف میں نے کیا
پھر اک جہان کو اپنے خلاف میں نے کیا

یہاں تو چپ تھے سبھی، مصلحت کے قیدی تھے
فصیلِ جبر میں لیکن شگاف میں نے کیا

کیا معاف نہ خود کو مواخذے میں کبھی
ستم گروں کا ستم تو مُعاف میں نے کیا

نقیبِ حق ہوں میں حق کے لیے تو بعض اوقات
خود اپنی رائے سے بھی اختلاف میں نے کیا

غزل پہ گرد جمی تھی پرانے لہجوں کی
اِس آئنے کو مگر کچھ تو صاف میں نے کیا

میں جانتا تھا اُسے حق پہ کون بولے گا
وہ شخص میں ہی تھا، یہ اِنکشاف میں نے کیا

ہر ایک زاویے سے جانچنا ضروری تھا
اِسی لیے تو کسی کا طواف میں نے کیا

۞

ہر نئے دن اَجنبی قریوں کے منظر دیکھنا
ایک بنجارے کی قسمت میں کہاں گھر دیکھنا

دیکھنا اَپنی محبت کا اَثر، اِک دن اُسے
آنکھ بھر کر دیکھنا، پھر اُس کے تیور دیکھنا

جب سے دیکھا وہ قدِ زیبا، مرا معمول ہے
روز صحنِ باغ میں آ کر صنوبر دیکھنا

اُس کی آنکھیں دیکھ کر مجھ کو یہ اندازہ ہُوا
کس قدر دل کش نظارا ہے سمندر دیکھنا

میں نے راہوں میں اُگائے ہیں مُرادوں کے گلاب
موسمِ گل آئے تو گھر سے نکل کر دیکھنا

میں محاذِ زندگی پر ہوں، مری قسمت میں ہے
روز اپنی سَمت بڑھتا غم کا لشکر دیکھنا

عاصمؔ اِس بستی کے اَفسردہ مکانوں کو ذَرا
جب سرِ بام آئے وہ مہتاب پیکر، دیکھنا

وہ ہجرتوں کا کرب بھی کچھ اِنتہا کا تھا
لیکن ہمارا حوصلہ یارو بلا کا تھا

ہاتھ اِس لیے جلے کہ بہت تیز تھی ہَوا
اور ہم کو بس خیال دیے کی بقا کا تھا

روشن چراغِ یاد بھی کرتا نہ تھا کوئی
قبضہ ہمارے شہر پہ ایسی ہَوا کا تھا

وہ بھی شکستہ حال تھا، فاقوں کی زد میں تھا
میرے ہی جیسا حال مرے دلرُبا کا تھا

گزرا نہیں ہے سر سے تو سرخاب تک کوئی
لیکن مرے مزاج پہ سایہ ہما کا تھا

ہم نے پھر اپنے پیٹ کے پتھر چھپا لیے
جب سامنے سوال ہماری اَنا کا تھا

مجھے تو اپنی ہی پس ماندگی نے قتل کیا
میں روشنی تھا مجھے تیرگی نے قتل کیا

یہ بت بھی آج ہمارے لہو کے پیاسے ہیں
ہمیں تو اپنے فنِ آزری نے قتل کیا

اجل بچھاتی رہی کیسے کیسے دام فریب
"قدم قدم پہ ہمیں زندگی نے قتل کیا"

یہ کون شخص ہے چھایا ہُوا زمانے پر
وہی تو ہے جسے پچھلی صدی نے قتل کیا

سپاہ کم تو نہ تھی تیری اے امیرِ سپاہ
اُسے تو صرف تری بزدلی نے قتل کیا

میں رہنا سیکھ نہ پایا تھا بے ضمیروں میں
مجھے یہاں پہ مری آگہی نے قتل کیا

شعر جو سرخیِ اَخبار نہیں ہو سکتا
اس سے کم تر مرا معیار نہیں ہو سکتا

جس سے حق بات کا اِظہار نہیں ہو سکتا
وہ کسی کا بھی وفا دار نہیں ہو سکتا

کس سہولت سے گئے دشتِ جنوں کے ہم پار
لوگ کہتے تھے کہ یہ پار نہیں ہو سکتا

جسم کیا رُوح میں ہے ذائقہ تیرے غم کا
غم کوئی اِتنا مزے دار نہیں ہو سکتا

تیر نظروں کا اُتر جاتا ہے سیدھا دل میں
اس سے بہتر کوئی ہتھیار نہیں ہو سکتا

اُس کے غم کے کئی اَنبار لگے ہیں دِل میں
جانتا ہوں کہ میں نادار نہیں ہو سکتا

کوئی پوچھے تو بتا دُوں گا میں دِل کی باتیں
مجھ سے اَب عشق کا اِنکار نہیں ہو سکتا

جب کسی شخص کی قسمت میں سِیہ بختی ہو
پھر تو سُورج بھی مددگار نہیں ہو سکتا

پھینک عاصمؔ پہ ذرا دامِ محبت پھر دیکھ
کون کہتا ہے، گرفتار نہیں ہو سکتا

میں سوچ بھی نہ سکتا تھا احسان یوں ہُوا
رحم آیا اُس کو، غم سے میں ہلکان یوں ہُوا

لوگوں کو کیا تمھیں بھی خبر تک نہ ہو سکی
کوئی تمھارے نام پہ قربان یوں ہُوا

ہم بے کسوں کی عزت و توقیر بھی گئی
اِک اہلِ زر کا شہرۂ احسان یوں ہُوا

کاٹیں نہ اُس کو دیکھ کے لوگوں نے انگلیاں
اِک مہ جبیں کے حسن کا کفران یوں ہُوا

آئینہ وہ نہ تھا مگر آئینہ بن گیا
دیکھا جو مجھ کو سامنے حیران یوں ہُوا

سب کچھ لٹا چکا تھا کہ پانسہ پلٹ گیا
اِس زندگی کے کھیل کے دوران یوں ہُوا

اُن کو خود اپنی جیت پہ شرمندگی ہوئی
اب کے مری شکست کا اعلان یوں ہُوا

درد کو اشتہار مت کرنا
دوست یہ کاروبار مت کرنا

میں ابد کے سفر پہ نکلا ہوں
زحمتِ انتظار مت کرنا

میرا سچ بھی ہے میری مجبوری
تم مرا اعتبار مت کرنا

فیصلہ موسم کرے گا آپ ہی
اب کے کتنا پھل پڑے اشجار پر

پیار اک ریت کا گھروندا ہے
ریت پر انحصار مت کرنا

ٹوٹ کر چاہنا، مگر اُس کو
ذہن و دل پر سوار مت کرنا

سوزِ غم سے سلگ سلگ کر تم
سروِ تن کو چنار مت کرنا
فاختہ امن کا پرندہ ہے
اِستعارہ، شکار مت کرنا
پیار میں ہارنا ہی بہتر ہے
جیت کو افتخار مت کرنا
ہیں قفس میں جسم پر بارِ گراں
کاٹ دے صیاد سب بے کار پر
بدگمانی کی ہر خلیج کو تم
پاٹنا، بے کنار مت کرنا
اک مرا جرم سامنے رکھنا
نیکیوں کو شمار مت کرنا
رہ میں اُس کی بچھانا مت پلکیں
راہ کو خار زار مت کرنا
خلعتِ فاخرہ ملی عاصمؔ
تو اِسے داغ دار مت کرنا

گو چاند بھی حسیں ہے رُخِ یار کی طرح
لیکن ہے زرد سا کسی بیمار کی طرح

قیمت نہیں ہے پاس پر اُس کی طلب تو ہے
ہم بھی کھڑے ہوئے ہیں خریدار کی طرح

میں ایک بت تراش بھی، اِک بت شکن بھی ہوں
جینا پڑا ہے مجھ کو اداکار کی طرح

بس اِک تری خموش طبیعت مرے ندیم
حائل ہمارے بیچ ہے دِیوار کی طرح

چھو کر مرے وُجود کو زخموں سے بھر گیا
وہ خوبرُو ملا بھی تو تلوار کی طرح

گزرا آنکھوں سے مری وہ گُلِ لالہ اکثر
میں نے شعروں میں دیا جس کا حوالا اکثر

میں نے جس خاک پہ پیروں کو جمانا چاہا
اُس نے گیندوں کی طرح مجھ کو اچھالا اکثر

موسمِ گل میں دریچے سے در آتی کرنیں
کھول دیتی ہیں مرے ذہن کا تالا اکثر

چند باتوں کو خفی جان کے رکھا ورنہ
جو بھی محسوس کیا شعر میں ڈھالا اکثر

انکساری سے ملا، میں تو ملا ہوں جس سے
کرتا رہتا ہوں گناہوں کا اِزالہ اکثر

پھول وہ چھین لیا مجھ سے صبا نے عاصمؔ
جس کو صرصر کے شدائد سے سنبھالا اکثر

حرف تو آتا ہے پھر کردار پر
داغ دامن پر ہو یا دستار پر

مجھ کو جانا ہے اُفق کے پار تک
اُڑتی کونجو دو مجھے دو چار پر

گزری اُس چڑیا کی صورت اپنی عمر
تھک کے آ بیٹھی ہو جو دیوار پر

امن کے ایام میں بھی چاہیے
زنگ لگنے پائے نہ تلوار پر

ڈھونڈتا ہے خود سفینوں کو بھنور
کیوں دھریں اِلزام کھیون ہار پر

ہم سے کچھ اہلِ جنوں کو چھوڑ کر
کون چڑھتا ہے خوشی سے دار پر

نام عاصمؔ اُس کا میرے نام کے
ساتھ کس نے لکھ دیا دیوار پر

گھر میں کیوں رکھیں تجھے اے غالیہ مو باندھ کر
کون رکھے بکریوں کی طرح آہو باندھ کر

اک جگہ ایسے کھڑے ہیں یہ ستارے شام سے
آسماں پر جیسے رکھ دے کوئی جگنو باندھ کر

اُس کو آخر شاملِ بادِ نفس ہونا تو تھا
پھول بھی رکھتے کہاں تک اپنی خوشبو باندھ کر

آپ ہی تولوں گا میں اچھے بُرے اَعمال کو
دفن کرنا مجھ کو سینے سے ترازو باندھ کر

رات کو آزاد ہو جاتے ہیں جانے کس طرح
سارا دن رکھتا ہوں میں تو اپنے آنسو باندھ کر

آج عاصمؔ ایک بنگلے میں ہے جشنِ نو بہار
بے بسی ناچے گی پھر پیروں میں گھنگرو باندھ کر

ٹوٹ کر پتا ہو جب گم آس پاس
پیڑ بھی ماں کی طرح ہو بد حواس

موتیوں سے کھیلنے والی پری
لے مرے آنسو بھی رکھ لے اپنے پاس

چاند نکلے ابر سے تو یوں لگے
گل بدن جیسے ہو کوئی بے لباس

جھیل سی آنکھیں جسے پیاسا رکھیں
کب بجھے اُس کی سمندر سے بھی پیاس

اِک ذرا سی ٹھیس سے ہو چُور چُور
لے مرا دل ہے کہ شیشے کا گِلاس

کس مرکب سے بنا لہجہ ترا
جس قدر تلخی ہے اُتنی ہی مٹھاس

مُدّعا سمجھے گا عاصمؔ کون، جب
گونگی نظروں سے کرو گے التماس

قائم تھی ظلمتوں کی حکومت سویر تک
کرتے رہے چراغ، بغاوت سویر تک

پہلی کرن کو دیکھ کے چپ ہو گئے کہ جو
سورج کو کر رہے تھے ملامت سویر تک

تاریکیوں کا آج بھی حملہ شدید تھا
ہاری نہ جگنوؤں نے بھی ہمت سویر تک

ساقی سے اور لوگ بھی رکھتے ہیں رسم و راہ
آئے گی سامنے یہ حقیقت سویر تک

تاروں نے ٹوٹ ٹوٹ کے رکھی ہے برقرار
شب خون مارنے کی روایت سویر تک

عاصم کوئی کتاب ہی پڑھ لیں ذرا سی دیر
جاناں کو سوچنے کی ہے فرصت سویر تک

ہمراہ تو نہیں تو ہے ویران سی سڑک
آبادیوں میں بھی لگے سنسان سی سڑک

کل شام پہلی بار میں تیرے بغیر تھا
کل مجھ کو دیکھتی رہی حیران سی سڑک

سوچوں تو کس قدر ہے پہنچنا مرا کٹھن
دیکھوں تو تیرے شہر کو آسان سی سڑک

اُس سمت سارے پوش علاقے ہیں شہر کے
لگتی ہے شب کو ایک پرستان سی سڑک

منظر عجب عجب ہیں نگاہوں کے سامنے
ہے کتنی دلفریب یہ انجان سی سڑک

لگتا ہے شہر چھوڑ گیا پھر کوئی حسین
کچھ دن سے لگ رہی ہے پریشان سی سڑک

عاصمؔ اُسے تو گھر سے نکلتے ہی ڈس گئی
اک زندہ سانپ بن کے یہ بے جان سی سڑک

ہم نے چاہا تھا جسے سارے زمانے سے الگ
کاش ہوتا کسی معقول بہانے سے الگ

تجھ سے وابستہ تھا کیا، دل کا سبھی صبر و قرار
دل ہُوا مجھ سے ترے چھوڑ کے جانے سے الگ

ہم سے بچھڑا تو کھُلا بھید یہ ہم پر اِک شخص
اپنے گھر سے ہی نہیں، تھا وہ گھرانے سے الگ

طنز کا تیر نشانے پہ ہی لگتا ہے سدا
پھینکا جائے یہ کہیں خواہ نشانے سے الگ

چین لینے نہ دیا گردشِ دوراں نے مجھے
میرا قصہ ہے محبت کے فسانے سے الگ

گھر کی تقسیم سے ہوتا نہیں تقسیم لہو
بھائی ہوتے نہیں دِیوار اُٹھانے سے الگ

مجھ سے کیسا جُڑا بیٹھا تھا وہ تاریکی میں
ناگہاں ہو گیا اک شمع جلانے سے الگ

اُس کی مالا میں تھا اک گنجِ جواہر عاصمؔ
خالِ رخسار کا موتی تھا خزانے سے الگ

☆ پہلے تین اشعار مرحوم دوست جاوید شاہد کی یاد میں

بے سبب بوجھ ہے تجھ پر ترا خنجر قاتل
تیرے اَبرو ترے خنجر سے ہیں بڑھ کر قاتل

نوعِ انسانی کہاں جائے کہ اِس دھرتی پر
کہیں پربت، کہیں صحرا، کہیں ساگر قاتل

مار ڈالے نہ کہیں مجھ کو مرا اپنا ضمیر
گھات میں بیٹھا ہے چھپ کر مرے اندر قاتل

میں نے دشمن کی بھی غیرت کا بہت پاس کِیا
کاٹ گردن مری پگڑی کو بچا کر قاتل

سرگراں رہتا ہے اب ظلم کے احساس سے تُو
کوئی خمیازہ بھگت، ہو جا سبک سر قاتل

روز اُٹھتے ہوئے غیرت کے جنازے دیکھوں
پسِ پردہ ہے کہیں حسن، کہیں زر قاتل

دشمنی کم بھی ہوئی مار کے دشمن کو کبھی
تجھ کو اتنی سی خبر بھی نہیں خود سر قاتل

دو ٹکوں کے لیے لکھیں جو قصیدے عاصم
پوری اک نسل کے ہوں ایسے سخن ور قاتل

ایک یہ فرض ادا کیوں نہیں ہوتا جاناں
تم سے اقرارِ وفا کیوں نہیں ہوتا جاناں

میں کہ سیراب کروں روز اِسے اشکوں سے
آس کا پیڑ ہرا کیوں نہیں ہوتا جاناں

جتنی چاہت تمہیں دی، اُتنی ہی واپس مانگی
تم سے یہ قرض ادا کیوں نہیں ہوتا جاناں

ترے ہاتھوں کو ہے دیکھا، مجھے اِتنا تو بتا
اِن پہ اب رنگِ حنا کیوں نہیں ہوتا جاناں

اِن دنوں مجھ پہ محبت کا اثر غالب ہے
پھر بھی اِظہارِ وفا کیوں نہیں ہوتا جاناں

دل کو معلوم ہے اِس کی نہیں مانی جانی
پھر بھی خاموش بھلا کیوں نہیں ہوتا جاناں

غمِ جاناں بھی ہے اب فکرِ معیشت کی طرح
غم ترا ہوش رُبا کیوں نہیں ہوتا جاناں

پہلے تو دل کے الاؤ کو بجھا دیتا ہوں
پھر دبی راکھ کو آہوں کی ہوا دیتا ہوں

کیا خبر لوٹ کے بچپن مرا واپس آ جائے
روز گزرے ہوئے لمحوں کو صدا دیتا ہوں

خوابِ غفلت سے جگا دیتی ہیں مجھ کو ہر روز
چہچہاتی ہوئی چڑیوں کو دُعا دیتا ہوں

ہونٹ کھولوں تو زمانے کو خبر ہو جائے
قصۂ شوق اُسے آنکھوں سے سنا دیتا ہوں

وہ پری چہرہ کہ جس میں نہ ہو پندارِ جمال
میں اُسے یاد نہیں رکھتا، بُھلا دیتا ہوں

عاصمؔ اک جذبۂ لافانی مرے ہاتھ لگا
دل کی دنیا کو بھی آج ایک خدا دیتا ہوں

اثرِ جادوئے لیلیٰ سے نکل آیا ہوں
عقل کا شکریہ صحرا سے نکل آیا ہوں

کہیں ہارے ہوئے لوگوں کو نہیں ملتی اماں
دشمنو لشکرِ پسپا سے نکل آیا ہوں

مجھ کو حیرت سے سبھی لوگ یہاں دیکھتے ہیں
میں وہ دریا ہوں کہ صحرا سے نکل آیا ہوں

مجھ کو تو چیخنا تھا، شور مچانا تھا بہت
میں تو لب بستہ ہی دُنیا سے نکل آیا ہوں

ایک خوش شکل کی آنکھوں سے اماں مانگی ہے
حرم و دیر و کلیسا سے نکل آیا ہوں

اب مری نظروں میں یکساں ہیں بہار اور خزاں
عمر کے عہدِ تمنا سے نکل آیا ہوں

بارِ احساں تلے دب کر ہی نہ مر جاتا کہیں
شکر ہے دستِ مسیحا سے نکل آیا ہوں

کیا ہوُا دوست تری آنکھ کی گہرائی کو
مجھ کو لگتا ہے میں دریا سے نکل آیا ہوں

میرے کمرے میں کتابوں کے سوا کچھ بھی نہیں
غمِ دنیا کے نصابوں کے سوا کچھ بھی نہیں

قعرِ دریا میں تو جویائے دُرِ ناب اُتر
سطحِ دریا پہ حبابوں کے سوا کچھ بھی نہیں

دور سے جو لگے مَوّاج سمندر کی طرح
پاس آؤں تو سرابوں کے سوا کچھ بھی نہیں

تجھ کو دیتے ہیں سکوں شہر کے آثارِ جدید
میری بستی میں خرابوں کے سوا کچھ بھی نہیں

پیار، آسودگیٔ دل جسے سمجھے دنیا
زندگی بھر کے عذابوں کے سوا کچھ بھی نہیں

علم چاہو تو مرے مکتبۂ فکر میں آؤ
مدرسوں میں تو نصابوں کے سوا کچھ بھی نہیں

اپنی منزل پہ وہی لوگ سدا پہنچے ہیں
ہر کڑے وقت میں جو عزم جواں رکھتے ہیں

جب بھی خیرات میں ملتی ہے محبت ہم کو
اپنے کشکول کو ہم لوگ الٹ دیتے ہیں

اپنے ہاتھوں میں قلم بھی ہے عصا کی صورت
ہم فراعینِ زمانہ سے کہاں ڈرتے ہیں

کس طرح ہم کو ڈرائے گا مسلح دشمن
ہم نہتے ہی سہی، دستِ دعا رکھتے ہیں

دوست دشمن نکل آیا تو نئی بات نہیں
آستینوں میں بھی کچھ سانپ پلا کرتے ہیں

راہِ ہستی میں کسی موڑ پہ ملنے والے
پھر کسی موڑ پہ ویسے ہی بچھڑ جاتے ہیں

تو کہ حیراں ہے فنِ جیب تراشی پہ بہت
لوگ تو خواب بھی آنکھوں سے چرا لیتے ہیں

پیار کا عہد کبھی ان سے نہ مانگو عاصمؔ
ایسی باتوں سے حسیں لوگ خفا ہوتے ہیں

لکھنؤ اور نہ دلی کی کوئی بات کریں
ہم فقط تذکرۂ قریۂ گجرات کریں

حالِ دل اُن سے کہا کیوں نہیں، میرے جذبات
کسی بچے کی طرح مجھ سے سوالات کریں

آپ کو شعر سنائیں گے، دِکھائیں گے دل
آج کی شام اگر ہم سے ملاقات کریں

شام ڈھلنے کو ہے کیوں گھر نہیں لوٹی چڑیا
ننھے بچوں کو پریشاں کئی خدشات کریں

دیکھ کر کانپ اُٹھیں ہم سے گنہ گار جنہیں
ایسے بھی کام کئی آج کے سادات کریں

کتنے بے نام گزارے سبھی گزرے موسم
اب یہ سوچا ہے ترے نام یہ برسات کریں

سیلاب کے ریلے یہ کہے جاتے ہیں
دیکھو تو مکاں کیسے ڈھے جاتے ہیں

تم چاہے اِسے تلخ کلامی کہہ لو
ہم لوگ تو سچ بات کہے جاتے ہیں

ممکن ہے کہ کل کوئی قیامت ڈھا دیں
ہم آج اگر جبر سہے جاتے ہیں

ہم نکلے ہیں دوری کے سفر پر پھر بھی
اک شب تری بستی میں رہے جاتے ہیں

سیراب نہ ہوں کھیت تو اُن کی قسمت
دریا تو بہر طور بہے جاتے ہیں

کوئی خوشی نہیں دیتے ملال دیتے ہیں
ہم اپنے بچوں کو رزقِ حلال دیتے ہیں

وہ لڑکیاں جو گھنے جنگلوں میں پھول چنیں
انھیں غزال سکھا اپنی چال دیتے ہیں

تلافی چاہو گئے وقت کی تو ہم تم کو
نئی صدی کے نئے ماہ و سال دیتے ہیں

ہمارے گھر کے اندھیرے چھٹے ترے دم سے
ہم آفتاب کو تیری مثال دیتے ہیں

کٹے جو وقت ترے ساتھ، ہم حفاظت سے
اسے بھی گھر کے ٹرنکوں میں ڈال دیتے ہیں

وہ لوگ بخشیں دلوں کو جو دھڑکنیں اُن کو
یہ لوگ کیسے دلوں سے نکال دیتے ہیں

بڑے تپاک سے آتی ہے زندگی ملنے
بڑے سلیقے سے ہم اُس کو ٹال دیتے ہیں

بات اُن کی کوئی کب کاٹتے ہیں
ہم تو بس اپنے ہی لب کاٹتے ہیں

عمر رو رو کے یوں کاٹی ہم نے
جس طرح ہجر کی شب کاٹتے ہیں

زندگی جیسے ہو بیمار کی رات
اس طرح وقت ہم اب کاٹتے ہیں

کشتِ خمیازہ ہے دنیا، جو لوگ
ظلم بوتے ہیں غضب کاٹتے ہیں

اشک بوئے تھے بزرگوں نے سو ہم
آج یہ فصلِ طرب کاٹتے ہیں

ہوں اسیرِ غمِ فرقت عاصمؔ
دیکھیں یہ طوق وہ کب کاٹتے ہیں

غم اگرچہ کثیر لایا ہوں
حوصلہ بھی خطیر لایا ہوں

خواہشیں مختصر سی رکھتا ہوں
دل غنی و فقیر لایا ہوں

کیسا پاگل ہوں، تیرے گھر سے میں
کھینچ کر اک لکیر لایا ہوں

شب میں بھی راستا مجھے مل جائے
ایسا روشن ضمیر لایا ہوں

کاٹ کر کوہِ غم کو، اشکوں کی
میں بھی اک جوئے شیر لایا ہوں

دکھ مجھے بھی ہیں سو غزل میں مَیں
طرز و اُسلُوبِ میرؔ لایا ہوں

یہ دریا پربتوں سے اک کہانی ساتھ لائے ہیں
سمندر تک پہنچنے کو روانی ساتھ لائے ہیں

انھیں معلوم تھا اکثر زمینیں خشک ہوتی ہیں
پرندے آنکھ میں تھوڑا سا پانی ساتھ لائے ہیں

یہاں آئے تو ہیں ہم مستقل آباد ہونے کو
مگر اِک عادتِ نقلِ مکانی ساتھ لائے ہیں

کبھی ایسا نہیں ہوتا وہ تنہا ہی ملیں ہم سے
وہ جب تنہا بھی آئے، بدگمانی ساتھ لائے ہیں

یقیں تھا تم ہمیں ہر حال میں پہچان سکتے ہو
مگر پھر بھی محبت اک نشانی ساتھ لائے ہیں

مرے احباب میری رونقِ محفل بڑھانے کو
اُنھیں بھی جو مرے دشمن ہیں جانی، ساتھ لائے ہیں

گلِ تازہ بھی ہیں کچھ ساتھ خط کے، نامہ بر گویا
تمام الفاظِ مشکل کے معانی ساتھ لائے ہیں

عدو کے واسطے زیتون اور انجیر کے تحفے
روایت ہے ہماری خاندانی، ساتھ لائے ہیں

نہ جانے اپنے آنسو خشک ہو جائیں کہاں عاصمؔ
اِس اندیشے سے ہم چھاگل میں پانی ساتھ لائے ہیں

کٹ گئی عمر سب عذابوں میں
ہم نہ ڈوبے مگر شرابوں میں

چند لمحوں کی زندگی ہی سہی
ہے مگر زندگی حبابوں میں

بھیجنا تھا بس ایک شعر اُسے
کھو گئے اَن گنت کتابوں میں

پھر بھی سنتے ہیں لوگ، کچھ تو ہے
شاعروں خانماں خرابوں میں

پھول دیتے ہیں درس الفت کا
اِس لیے رکھتے ہیں کتابوں میں

اُن لبوں سا نہیں کسی کا رنگ
رنگ پنہاں ہیں سو گلابوں میں

اُس کی آنکھیں ہی پڑھتے رہتے ہیں
ہم پڑے ہی نہیں نصابوں میں

جہاں زمین ہو اچھی سبھی ادھر جائیں
نکل کے دشت سے اہلِ جنوں کدھر جائیں

ہے گردشوں سے مرا ناتا اِس قدر گہرا
کہ ساتھ ساتھ مری ناؤ کے بھنور جائیں

مرے حریف سے درپردہ ربط ہے ان کا
یہاں سے اُٹھ کے وہاں میرے چارہ گر جائیں

اگر سمیٹ نہ لوں اِن کو اپنے دامن میں
کہاں کہاں نہ تری آنکھ کے شرر جائیں

گواہ بھی تو نہیں ہے کوئی محبت کا
سو کوئی چارہ نہیں آپ گر مکر جائیں

خدا سمجھتا ہے خود کو جو ناخدا عاصم
تو اُس کی کشتی سے بہتر ہے ہم اُتر جائیں

ستاروں کو ضیا دو شہر والو
دیے سارے بجھا دو شہر والو

ستاروں میں کہیں جو بس گیا ہے
مجھے وہ شخص لا دو شہر والو☆

مجھے باہر نکلنا ہے یہاں سے
ذرا سا راستہ دو شہر والو

یہاں اک گاؤں تھا وہ کیا ہُوا ہے
مرے گھر کا پتا دو شہر والو

تغافل کیش کب سے سو رہے ہیں
اِنھیں بھی اب جگا دو شہر والو

برہنہ چاندنی گلیوں میں گھومے
سبھی پردے گرا دو شہر والو

جنوں کی آگ بجھتی جا رہی ہے
اِسے تھوڑی ہَوا دو شہر والو

ہوں گھر تقسیم در تقسیم کب تک
یہ دیواریں گرا دو شہر والوں

ہے بھید اک آگہی کا پاس میرے
مجھے دو گھونٹ لا دو شہر والو

✿

☆ حاجی عبدالخالق مرحوم کے لیے

ہم تمھیں ہوش میں لاتے ہیں ذرا ٹھہرو تو
عرقِ تاک پلاتے ہیں ذرا ٹھہرو تو

تم کہاں جاؤ گی اے گردشِ دوراں تنہا
اب کے ہم ساتھ ہی جاتے ہیں ذرا ٹھہرو تو

ہے پسِ پردۂ آئینۂ شفاف تو زنگ
تم کو دل اپنا دِکھاتے ہیں ذرا ٹھہرو تو

جب بھی ملتے ہیں یہی کہتے ہیں ہمدرد مرے
ہم ترا درد بٹاتے ہیں ذرا ٹھہرو تو

خوف آئے نہ تمھیں راہ کی تاریکی سے
دیپ اشکوں کے جلاتے ہیں ذرا ٹھہرو تو

بن بتائے ہی چلے آؤ گے معلوم نہ تھا
اپنے کمرے کو سجاتے ہیں ذرا ٹھہرو تو

ہم وہیں ہیں کہ جہاں تم نے کہا تھا ہم سے
ہم ابھی لوٹ کے آتے ہیں ذرا ٹھہرو تو

خوب انسان ہے ملتا ہے تو بچھ جاتا ہے
تم کو عاصمؔ سے ملاتے ہیں ذرا ٹھہرو تو

دائمی قرب کا وشواس دلا دے مجھ کو
روز اک واہمہ فرقت کا ڈرا دے مجھ کو

شب کسی شخص کی یادوں میں گزر جاتی ہے
صبح کی پہلی کرن آ کے سُلا دے مجھ کو

قہر تو یہ ہے کہ اب خود مرا اپنا ہی ضمیر
میری ناکردہ گناہی کی سزا دے مجھ کو

ایک بلقیسِ وفا اب بھی ہے دنیا میں کہیں
کسی طائر سے کہو اُس کا پتا دے مجھ کو

تیری فرقت میں کروں چاک گریباں اپنا
یہ اجازت نہ کبھی میری اَنا دے مجھ کو

مجھ کو بخشی ہے اگر تو نے جنوں کی دولت
گھر میں اب ایک بیاباں بھی اُگا دے مجھ کو

زندگی کے سارے دکھ سب تلخیاں اپنی جگہ
اک تبسم تیرا ان کے درمیاں اپنی جگہ

بارشیں اپنی جگہ ہیں، آندھیاں اپنی جگہ
نرم کومل پھول کو خوفِ خزاں اپنی جگہ

فاصلہ کیوں بڑھ رہا ہے پھر ہمارے درمیاں
میرا گھر اپنی جگہ، اُس کا مکاں اپنی جگہ

میں جسے چھوڑ آیا گاؤں میں نہ بھولے وہ مجھے
پرکشش ہیں شہر کی بھی لڑکیاں اپنی جگہ

تھی طلوعِ ماہ کی اک بند کھڑکی منتظر
منتظر اک چاند کا میں بھی وہاں اپنی جگہ

پنجہ زن اپنی جگہ شب سے نجومِ آسماں
اور یہ میرے آنسوؤں کی کہکشاں اپنی جگہ

دیکھ کر حیراں ہیں عاصمؔ غازۂ جاناں کا رنگ
سارے پھول اپنی جگہ، سب تتلیاں اپنی جگہ

ہے کسی ماں کی طرح نخلِ ثمر دار کا دُکھ
خوشہ چیں کیسے سمجھ سکتے ہیں اشجار کا دُکھ

کون چاہت سے تجھے دے گا ترے فن پر داد
کس نے محسوس کِیا ہے کسی فن کار کا دُکھ

میں نے پھر بصرہ و بغداد کو جلتے دیکھا
میں نہ بھُولا تھا ابھی کابل و قندھار کا دُکھ

کبھی سیلاب کبھی موسمِ بے آب کا ڈر
ہم زمیں دار سمجھتے ہیں زمیں دار کا دُکھ

تم کو فرصت ملے دنیا کے مشاغل سے اگر
کبھی سوچو کسی مفلس، کسی نادار کا دُکھ

کتنی منہگی تھی وہ اک کانچ کی گڑیا عاصمؔ
مجھ سے دیکھا نہ گیا طفلِ خریدار کا دُکھ

مرے خیال کا محور نیا نہیں کوئی
وہی ہے اب بھی ستم گر نیا نہیں کوئی

وہی عدو ہے، وہی دوستی کا پردہ ہے
یہ میری پشت پہ خنجر نیا نہیں کوئی

وہی ہے دل کی حویلی شکستہ و خستہ
وہی مکین ہے اندر نیا نہیں کوئی

ارادہ ملنے کا اُس نے کیا نہیں ورنہ
وہ جانتا تھا مرا گھر، نیا نہیں کوئی

جو خیمہ زن ہے مقابل، میں جانتا ہوں اُسے
ہے میرا اپنا ہی لشکر، نیا نہیں کوئی

وہی ہے میرے عزیزوں کی کہکشاں عاصم
وہی ستارے ہیں، اختر نیا نہیں کوئی

ترے بغیر ادھوری ہے زندگی میری
تمام عمر خلا میں گزر گئی میری

ترے بغیر یہ حالت ہوئی ہے اب دل کی
کہ جیسے کھو گئی اک چیز قیمتی میری

اگر میں چل ہی دیا ہوں تو روک لو مجھ کو
یہ لازمی تو نہیں پھر ہو واپسی میری

بھٹک تو میں بھی گیا تھا پہ مجھ کو لے آئی
قریبِ منزلِ مقصود گمرہی میری

مرے کلام کو دیکھ احتیاط سے اے دوست
مصوری ہے دُکھوں کی یہ شاعری میری

میں اُس کی راہ میں آنکھیں بچھا تو دوں عاصمؔ
اُسے پسند نہیں بے تکلفی میری

کاش پوری کبھی حسرت ہوتی
اُن کو بھی ہم سے محبت ہوتی

غمِ ہستی، غمِ دوراں، غمِ دل
اِن سے اک لمحہ تو فرصت ہوتی

میں بھی ہوتا ترا آئینہ اگر
تو مری بھی کوئی قیمت ہوتی

تری تخلیق ہے آخر یا رب
کچھ تو انسان کی وقعت ہوتی

بارہا سجدے کیے دل نے اُسے
کاش مقبول عبادت ہوتی

زندگی جو بھی خوشی دیتی ہمیں
آپ ہی کی وہ ودیعت ہوتی

حال اُن سے کبھی کہتے عاصم
اِتنی تو ہونٹوں میں طاقت ہوتی

جدید شہر کا منظر نیا نہیں کچھ بھی
وہی جنوں، وہی پتھر، نیا نہیں کچھ بھی

وہی ہے دل کا سفینہ وہی سفر اپنا
وہی ہے غم کا سمندر، نیا نہیں کچھ بھی

تمھارے بعد چمن کیوں بدل گیا، گرچہ
وہی ہیں سرو و صنوبر، نیا نہیں کچھ بھی

وہی نگر ہے، وہی گرد سے اَٹے چہرے
نئی سحر کا بھی منظر نیا نہیں کچھ بھی

یہاں وہی ہے طریقہ جراحتِ دل کا
وہی ہیں طنز کے نشتر، نیا نہیں کچھ بھی

وہی ہے قحط مری سرزمیں پہ اب کے بھی
وہی ہے عرصۂ محشر، نیا نہیں کچھ بھی

اک سراب اِس میں بہر سمت رواں ملتا ہے
دشتِ غم میں کوئی ندی نہ کنواں ملتا ہے

اتنے مصروف ہوئے کارِ جہاں میں ہم لوگ
عشق کے واسطے اب وقت کہاں ملتا ہے

ہاں کچھ انسان تھے گزری ہوئی صدیوں میں یہاں
آج کے دور میں انسان کہاں ملتا ہے

ہم جہاں بیٹھ کے دل اپنا جلاتے تھے وہاں
اب بھی لپٹا ہُوا پیڑوں سے دھواں ملتا ہے

پھر ہرا ہونے کا دیتا ہے اِنہیں مژدہ بھی
جب درختوں سے گلے دورِ خزاں ملتا ہے

دھول جھونکی ہے یہ کس نے مری آنکھوں میں امینؔ
راہ ملتی ہے نہ منزل کا نشاں ملتا ہے

ذرا سوچ لے اُس نگر جانے والے
کہ پتھر ہوئے سب ادھر جانے والے

اُتر کر کبھی اُس کی آنکھوں میں دیکھیں
سمندر کی تہ میں اتر جانے والے

کہیں زندگی روٹھ جائے نہ ہم سے
ذرا سوچ لے روٹھ کر جانے والے

سمجھتا نہیں کیا میں آنکھوں کی بولی
مرے پاس سے چپ گزر جانے والے

ادھر آ، میں اپنا لوں دُکھ تیرے سارے
مری ہر خوشی روند کر جانے والے

ترے لوٹنے تک وہ جاگے گا کیسے
گئی رات میں اپنے گھر جانے والے

غمِ دنیا رہے اس میں کہ تری یاد رہے
دل کا ویرانہ کسی طور تو آباد رہے

حسن کا سب سے زیادہ ہے تناسُب جس میں
اُس قبیلے کے مخالف مرے اَجداد رہے

یوں تری یاد رہے دل پہ مسلط میرے
جس طرح مجھ پہ نگہباں مرا ہمزاد رہے

میں بھی اُس زلف کی زنجیر ہلانا چاہوں
سطوتِ حسن مگر مانعِ فریاد رہے

تم جو خوش ہو مجھے پابندِ سلاسل کر کے
وقت سب سے بڑا منصف ہے تمھیں یاد رہے

آنے پائے نہ ہَوا شہر کی اِس سمت کبھی
اِس تگ و دو میں مرے گاؤں کے افراد رہے

میں تو اک بھیڑ میں رُو پوش رہا ہوں عاصمؔ
مجھ سے انجان مرے عہد کے نقاد رہے

جب کسی شخص پہ تہمت لگ جائے
داؤ پر گاؤں کی عزت لگ جائے

پھر وہ انمول کہاں رہتی ہے
جب کسی چیز کی قیمت لگ جائے

اُس کی آنکھوں سے کہیں ایسا نہ ہو
مجھ کو مے نوشی کی عادت لگ جائے

حسن بازار میں لے آئے وہی
ہاتھ جس کے بھی یہ دولت لگ جائے

نزع میں اُس کا ہے فن یوں سمجھو
جس کو بیماریِ جدت لگ جائے

کچھ پرندے جو مرے گاؤں میں ہیں
اِن پہ پابندیِ ہجرت لگ جائے

یا مری گہری خموشی کو مؤثّر کر دے
یا مجھے نطق کے ہر لہجے پہ قادِر کر دے

ڈال دے پاؤں میں زنجیرِ غلامی دراصل
جب غریبوں پہ کرم کوئی مُخَیّر کر دے

ایک موہوم سی امید ترے ملنے کی
مثلِ یعقوب مجھے ہجر میں صابر کر دے

بھر دے اک رنگِ طرب درد کی تصویروں میں
معجزہ یہ بھی کسی روز مصوّر کر دے

اُس نے دیکھا تھا محبت کی نظر سے اک بار
کاش وہ مجھ پہ وہی ایک نظر پھر کر دے

مجھ کو تیری قسم نکلتا ہے
تو جو روٹھے تو دم نکلتا ہے

کھولتا ہوں جو پوٹلی دل کی
صرف تیرا ہی غم نکلتا ہے

صرف بدنامیاں ہی ملتی ہیں
عشق میں نام کم نکلتا ہے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

جب کٹھن ہو سفر مسافر کا
کون پھر ہمقدم نکلتا ہے

تجھ کو بھولوں، یہ فیصلہ لیکن
روز ہی کالعدم نکلتا ہے

کوئی لمحہ نہ چھین لے تجھ کو
سوچتا ہوں تو دم نکلتا ہے

جانے کیا ہو گیا ہے عاصم کو
آج کل گھر سے کم نکلتا ہے

بہت سی بجلیوں کو آزمانے کی ضرورت ہے
نشیمن پھر نیا کوئی بنانے کی ضرورت ہے

دیے سے پھر دیا جلتا چلا جائے گا محفل میں
فقط پہلا دیا تجھ کو جلانے کی ضرورت ہے

حصولِ منزلِ مقصود اِتنا سہل مت جانو
کہ اِس میں ذات کو اپنی مٹانے کی ضرورت ہے

تری سوچیں ہی بن کر رہ گئیں اب مشغلہ اپنا
تجھے اب سوچتا ہوں بھول جانے کی ضرورت ہے

مجھے معلوم ہے آنکھیں کھلی رکھتے ہو تم، لیکن
مرے لوگو! تمھیں پھر بھی جگانے کی ضرورت ہے

ہماری کھیتیوں پر بڑھ گیا ہے بوجھ اب عاصمؔ
ہماری اِس زمیں کو کارخانے کی ضرورت ہے

ٹھہر جانے کا بہت میں نے کہا تھا اُس سے
میری قسمت میں ہی لکھا تھا بچھڑنا اُس سے

وُہی سورج کہ اندھیرے سے جو کل ہار گیا
پھر نمودار ہُوا آج سویرا اس سے

ڈوبنا اُس کا مقدر ہی نہ ہو جائے کہیں
کہیں چھن جائے نہ تنکے کا سہارا اُس سے

تیری چاہت کی طلب دل سے مٹا دی جس نے
پھر ہرا ہو نہ سکا نخلِ تمنا اُس سے

زندگی بھر کے لیے دے گیا داغِ فرقت
مجھ کو ہر روز نہ ملنے کا گلہ تھا اُس سے

ہر غم و فکر کا درماں ہے فقط جامِ شراب
میرا بھی غم کے حوالے سے ہے ناتا اُس سے

مجھ سے بے وجہ خفا رہتا ہے اِک ماہ جبیں
میں نے کب وعدہ نبھانے کا کہا تھا اُس سے

انا پرست بڑی مشکلوں سے مارے گئے
اذیتوں سے نہیں، بخششوں سے مارے گئے

یہ زندگی تھی پہاڑ ایسی، بارشوں سے بچے
تو ہم لڑھکتے ہوئے پتھروں سے مارے گئے

جو اپنے زعم میں دشمن کو ناتواں سمجھے
وہ ہاتھیوں کی طرح چیونٹیوں سے مارے گئے

ہمیشہ ہم پہ کیا اپنے دوستوں نے کرم
ہم ایسے لوگ کہاں دشمنوں سے مارے گئے

زمیں کی گردشیں راس آ گئیں تھیں جن کو بہت
اے آسماں وہ تری گردشوں سے مارے گئے

تلاطموں سے تو ہم بچ گئے، پہ تیروں سے
جو ہم پہ پھینکے گئے ساحلوں سے، مارے گئے

ہر ایک دورِ گزشتہ گواہ ہے عاصمؔ
جب اہلِ علم لڑے جاہلوں سے، مارے گئے

دل میں اک آگ جلا لی جائے
پھر اُس آنچل کی ہوا لی جائے

ہم سمجھتے ہیں محبت کا مآل
اپنے سر کیوں یہ بلا لی جائے

حرفِ شیریں ہی عطا کر دو اُسے
در سے خالی نہ سوالی جائے

آج موسم بھی بڑا اچھا ہے
اُن کے دامن کی ہَوا لی جائے

زندگی جو ہے ہمارے دَر پَے
یہ بلا کس طرح ٹالی جائے

جا گرے اور کسی کے گھر میں
خواہش اِتنی نہ اُچھالی جائے

ہے زمیں سخت غزل کی عاصمؔ
کس طرح نہر نکالی جائے

کچھ بے ضمیر اپنے مددگار کر لیے
ہم نے خود اپنے راستے دُشوار کر لیے

جن کو نہ دن کے وقت بھی رستہ سُجھائی دے
ہم نے وہ لوگ قافلہ سالار کر لیے

بے موت مر گئے وہیں دشمن کے سامنے
لہجے جب اپنے ہم نے لچک دار کر لیے

آ ئے خزاں بہار نے پھر بے شمار پھول
قربانیوں کے واسطے تیار کر لیے

کیوں کر لگے گی بخت رسا کو کوئی نظر
کچھ غم شریکِ طالعِ بیدار کر لیے

تنہائی میں تو وہ نہیں ملتے ہمیں سو آج
شکوے گلے سبھی سرِ بازار کر لیے

عاصم کسی کے عشق میں مصروف یوں ہوئے
ہم نے تمام دوست ہی بیزار کر لیے

ہر اک کوشش تلاشِ رزق کی ناکام ہو جائے
سحر کو گھر سے نکلوں جستجو میں شام ہو جائے

وہ گھاٹے میں رہیں جو پیار کی بڑھ چڑھ کے بولی دیں
کہ بے قیمت ہی یہ جنسِ گراں نیلام ہو جائے

کسی قاصد، کسی مُخبر کی ہو کیوں کر ضرورت، جب
ہر اک جھونکا ہَوا کا دوست کا پیغام ہو جائے

زمانے بھر کے رُسوا لوگ ہیں ہم، سوچ لو شاید
تمھارا ہم سے ملنا باعثِ الزام ہو جائے

میں حالاتِ زمانہ سے حقائق اَخذ کرتا ہوں
پیمبر میں نہیں ہوں جو مجھے اِلہام ہو جائے

جیا میں مدتوں اُس کے بنا یہ سوچ کر عاصمؔ
کہیں ایسا نہ ہو میری وفا بدنام ہو جائے

تنہا جب آ رہی تھی تو بستی کی اَور سے
دھڑکا تھا تجھ کو دیکھ کے دل کتنے زور سے

آیا تھا سیرِ گل کو سکوں کے لیے مگر
کچھ اور سرگراں ہُوں عنادل کے شور سے

کس کا تھا مرنے والے کی آنکھوں کو انتظار
کیوں اُگ رہا ہے پودا یہ نرگس کا گور سے

مدت ہوئی ہے لب وہ چھوئے، آج بھی مگر
رِستا ہے خون ہاتھ کی اِک ایک پور سے

کھنچتا ہی جائے چاند سی صورت کو دیکھ کر
ملتی ہیں کتنی عادتیں دل کی چکور سے

دشمن سے بے خبر ہوں میں اُس طفل کی طرح
جس کا گلا کٹے کسی قاتل کی ڈور سے

تیرے پروں میں یہ اِسی دھرتی کے رنگ ہیں
یا ماورا کے رنگ ہیں پوچھوں گا مور سے

عاصمؔ چلو کہیں کسی جنگل میں جا بسیں
گھبرا گیا ہے دل مرا شہروں کے شور سے

زندگی ضد پہ جو اَڑ جاتی ہے
یہ گلے موت کے پڑ جاتی ہے

پیڑ ہوتا ہے تناور اُتنا
جتنی بھی خاک میں جڑ جاتی ہے

یوں بھٹکتا ہوں میں تنہا جیسے
ڈار سے کونج بچھڑ جاتی ہے

بارشِ غم نہ ہو آنکھوں سے اگر
دِل وہ بستی ہے اُجڑ جاتی ہے

زندگی ہے کہ کوئی بندر گاہ
اک خوشی روز بچھڑ جاتی ہے

کر دے اک یادِ تنفّس کو بحال
جب مری سانس اُکھڑ جاتی ہے

چاہوں مرنا بھی تو جینے کی امنگ
آ کے بس پاؤں ہی پڑ جاتی ہے

ایک چڑیا کو خبر ہے

ایک چڑیا کو خبر ہے
کس قدر دانے کسی دہقان کے خرمن میں ہیں

ایک چڑیا جانتی ہے
گل کھلے کتنے کسی گلشن میں ہیں

ایک چڑیا کو خبر ہے
لڑکیاں کتنی کسی آنگن میں ہیں
اور کون اُن میں سے بھاگے گی کسی بندے کے ساتھ

کھاتے پیتے آدمی کے ساتھ یا بھوکے کے ساتھ
نوجواں کے ساتھ یا بوڑھے کے ساتھ

ایک چڑیا جو کہ سب کچھ جانتی ہے
ربط کیوں رکھتی نہیں لیکن وہ مجھ ایسے کے ساتھ
میں کہ گن لیتا ہوں اک اُڑتی ہوئی چڑیا کے پر
کیوں مگر رکھتی نہیں ہے وہ مرے دل کی خبر

تنگ دستی

اب کے اِس عید پہ میں
کوئی تحفہ نہ تجھے بھیج سکا
کتنا شرمندہ اِس احساس نے رکھا مجھ کو

آخر اک سوچ نے سُولی سے اُتارا مجھ کو
جیسے میں چاہوں تجھے
چاہتے ہوں گے مجھے بھی کچھ لوگ
پر کسی نے کوئی تحفہ بھی نہ بھیجا مجھ کو

تجھ سے شرمندہ ہوں میں
مجھ سے شرمندہ ہیں احباب مرے
تنگ دستی نے کِیا ہر طرح رُسوا مجھ کو

سوال

ملک کا ہر پاسباں
ہر جیالا نوجواں
سب شریفُ النفس شہری، سارے عزت دار لوگ
زندگی کے مختلف شعبوں میں محنت کے سہارے
زندہ رہنے والے سب فنکار لوگ
اب دعا کرتے ہیں کاش اُن کی دعائیں ہوں قبول
پھر کوئی غازی، کوئی مردِ مجاہد، اَمن کا کوئی رسول
اِس زمیں کی سَمت بھی بھیجے خدائے کائنات
توڑ دے جو عشرتوں کے یہ نئے لات و منات
میں بھی ہوں اور لوگ بھی ہیں منتظر
کون آئے گا؟ کہاں سے آئے گا؟
جو حقیقت میں خلیفہ ہو خدا کا
کس جہاں سے آئے گا؟

جواب

شہر میں جب عصمتیں لٹنے لگیں
اور جب نچوائی جائیں برسرِ بازار ننگی عورتیں
دست بردِ بُلہوس سے ہو نہ جب محفوظ کوئی لاش بھی
جب بدن اپنے لہو کی آگ میں جلنے لگیں
خواہشیں بڑھنے لگیں
رشوتوں کی بھینٹ جب سندر طلائی جسم بھی چڑھنے لگیں
ہر مسافر ہو ہراساں ، راہبر ہو خود لٹیرا
ظلمتوں نے ہر طرف سے جب ہو گھیرا

جب برائے نام ہی انصاف ہو
قاتلوں کی آستیں جب داغِ خوں سے صاف ہو
بے گناہوں سے قفس آباد ہوں
مجرموں کے ہاتھ جب آزاد ہوں

کوبکو جب مے پرستی عام ہو

زُہد ہو رُسوا، شرافت شہر میں بدنام ہو

جب عبادت کارِ بے بنیاد ہو

تیز موسیقی سے دل ہر نوجواں کا شاد ہو

جب جہادِ فی سبیل اللہ بس نعروں تلک محدود ہو

دشمنوں کا اک نہ اک مخبر ہر اک بستی میں جب موجود ہو

اِن سبھی باتوں کا ہے بس اِک جواب

اِنقلاب و اِنقلاب

اب جیا نہیں جاتا

لوگ ٹھیک کہتے ہیں
ساتھ مرنے والوں کے
خود مرا نہیں جاتا

یہ بھی اک حقیقت ہے
چند لوگ دنیا میں
اتنے پیارے ہوتے ہیں
جو اگر بچھڑ جائیں
پھر جیا نہیں جاتا

”آ عندلیب“

اِک بس میں آ رہا تھا میں ڈنگہ سے کھاریاں
اُس بس میں بے تحاشہ بھری تھیں سواریاں
اپنی نشست میں نے کی اک گل بدن کو پیش
لازم ہیں عشق کے لیے خدمت گزاریاں
وہ لب پہ شکریے کی لرزتی ہوئی لکیر
آنکھوں میں اِمتنان کے رنگوں کی دھاریاں
یہ چاند کون ہے مرے دل نے کیا سوال
یہ حور کون ہے مری آنکھیں پکاریاں

لایا تھا میرا جذبۂ دل کھینچ کر اُسے
ورنہ سڑک پہ اور بھی کتنی تھیں لاریاں
ڈوبا ہُوا تھا ہر کوئی اپنے خیال میں
میرے لیے ہی خاص تھیں وہ جلوہ باریاں
جب میری بد حواسی پہ ہنستی وہ سیم تن
لگتی تھیں کشتِ زعفراں سرسوں کی کیاریاں
قسمت بُری تھی آ گئی منزل بہت ہی جلد
منزل پہ سب سواریاں بس نے اُتاریاں
جب وہ جدا ہوئی مرے دل نے دہائی دی
آنکھیں تڑپ اُٹھیں مری برہا کی ماریاں
موقع تھا پھر بھی پوچھ سکا نام تک نہ میں
ہائے یہ اہلِ عشق کی نا پختہ کاریاں
کیوں اُس پری کی یاد بھلائی نہ جا سکی
شرمندہ مجھ سے میری فراموش گاریاں
ممکن ہے پھر کہیں کسی رستے میں وہ ملے
رکھتی ہیں مجھ کو محوِ سفر بے قراریاں

اب میں ہوں اور سارا دن آوارہ گردیاں
اب میں ہوں اور رات بھر اختر شماریاں
کیا جانے کب دکھائی کسی موڑ پر وہ دے
آنکھیں تو اُس کا راستہ تک تک کے ہاریاں
رہتا ہوں صبح شام مسلسل سفر میں اب
میں کھاریاں سے ڈنگہ تو ڈنگہ سے کھاریاں
اُس کا پتا ملے تو میں بھیجوں اُسے یہ نظم
کب کام آئیں گی مری جادو نگاریاں
صبح و مسا کی فکرِ معیشت کے باوجود
اِس جستجو میں سینکڑوں چھٹیاں گزاریاں
آ بد نصیب مل کے کریں بین ہجر میں
''آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں''

پیکرِ آواز

اُسے دیکھا نہیں میں نے
فقط آواز ہی اُس کی سنی ہے فون پر اکثر
مگر آواز میں کچھ ایسا جادو ہے
کہ مجھ کو وہ پری پیکر
خود اپنے سامنے بیٹھا ہُوا محسوس ہوتا ہے
جب اُس سے بات ہوتی ہے
تو مجھ کو آلۂ ہاتف
اک ایسا آئنہ محسوس ہوتا ہے
کہ جس میں عکس ہے اُس کا
میں آئینے میں اُس کا عکس جب دیکھوں
وہ اِتنا خوش نما محسوس ہوتا ہے
کہ سانس اپنا مجھے رکتا ہُوا محسوس ہوتا ہے

یاد ہے تجھ کو

یاد ہے تجھ کو
جس دن میں نے اپنا رختِ سفر باندھا تھا
تو نے اک تعویز منگا کر میرے بازو پر باندھا تھا
اور کہا تھا
دوری کے بے انت سفر پر جانے والے
مجھ سے ربط برابر رکھنا
بیچ میں حائل چاہے سات سمندر رکھنا
یہ بستی جب تجھے پکارے
اُڑ کر آنا
اپنے ساتھ مری یادوں کے شہپر رکھنا

یاد ہے تجھ کو
تو نے کہا تھا
تجھ سے ناتا ٹوٹ گیا تو شدتِ غم سے بے کل ہو کر
اپنے حواس میں جی نہ سکوں گی، رہ جاؤں گی پاگل ہو کر

دیس دیس کی رنگ بھری اِن گلیوں میں اور اِن راہوں میں
مجھ کو پناہ تو مل سکتی تھی نرم و گداز حسیں باہوں میں
لیکن میں نے تیری خاطر خود کو وقفِ ملال ہی رکھا
میں نے تو ہر حال میں تجھ سے روح کا ربط بحال ہی رکھا

تو نے مگر اب خود ہی مجھ سے
پیار کا رشتہ توڑ لیا ہے
جانے کیوں منہ موڑ لیا ہے
شاید تو نے اور کسی سے
دل کا ناتا جوڑ لیا ہے
تیری نظر میں پچھواڑے کے پیڑ ہی بہتر

میں تو دُوری کا جنگل ہوں
تیری نظر میں چلتے کنویں کا پانی بہتر
میں تو ساون کا بادل ہوں
تیری نظر میں آج کی عشرت کوشی بہتر
میں تو آنے والا کل ہوں
تیری نظر میں پاس پڑوس کا ساتھی بہتر
میں تو نظروں سے اوجھل ہوں
تو نے پاگل ہو جانے کا جھوٹ ہی بولا
میں تو اب سچ مچ پاگل ہوں

امین عاصم طبعاً کم آمیز واقع ہوئے ہیں، وہ بے اندازہ میل جول کو محض تضیعِ اوقات خیال کرتے ہیں، اُن کے نزدیک کسی تخلیق کار کی تخلیقی کاوش ہی اُس کا بہترین تعارف ہوتی ہے، اِسی نظریے کے پیشِ نظر متاعِ دقت کی قدر کرتے ہوئے وہ ہمیشہ پوری یکسوئی سے فنی ریاضت میں مشغول رہے، وہ جذبوں کی حرارت کو شعروں میں منتقل کرنا جانتے ہیں جبھی تو اُن کے اکثر شعر بولتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ ظاہر پسندی اور مادہ پرستی کے اس پُرفتن دَور میں جہاں خونی رشتے بھی اپنی کشش سے محروم ٹھہرتے ہیں وہاں امین عاصم کے باطن میں اِنسانی رشتوں کی قدر و اہمیت اَبدیت پا رہی ہے، جس کی ایک جھلک اس شعر میں دیکھی جا سکتی ہے۔

گھر کی تقسیم سے ہوتا نہیں تقسیم لہو
بھائی ہوتے نہیں دِیوار اُٹھانے سے الگ

امین عاصم شاعری کے آئینے میں جتنے خوب صورت نظر آتے ہیں، شخصیت کے اِعتبار سے بھی اتنے ہی دِلنشیں ہیں، اُن کا ایک شعر اُن کی روزمرہ زندگی کا غماز ہے۔

خوب اِنسان ہے ملتا ہے تو بچھ جاتا ہے
تم کو عاصم سے ملاتے ہیں، ذرا ٹھہرو تو

محبت اُن کی شاعری کا بنیادی حوالہ ہے لیکن گھسے پِٹے رومانوی خیالات میں اُلجھنے کی بجائے اُنھوں نے اپنے اکثر ہم عصروں سے ذرا ہٹ کر مختلف صورتوں میں اس جذبے کا اِظہار کیا۔ خیالات واحساسات میں تنوع پیدا کر کے اُنھوں نے اپنے کلام کو یکسانیت کا شکار ہونے دیا نہ ہی کسی خاص نظریہ وفکر کی چھاپ لگنے دی۔ اُسلوب کے حوالے سے اُنھوں نے اِنفرادیت پیدا کرنے کی کوشش کی اور اپنی بات اپنے ہی انداز سے کہی۔ اُن کی شاعری میں ذات سے کائنات تک تمام رنگ جھلکتے ہیں، اُمید ہے یہ شعری مجموعہ ادبی سرمائے میں خوب صورت اِضافہ ثابت ہوگا۔

میں اُن کی تخلیقی اُڑان میں مزید بلندیوں کے لیے دُعا گو ہوں۔

سید انصر

۱۷ نومبر ۲۰۰۸ء